

DEEWAN-E-ZAFAR

By

Abulmuzaffar Mohammad Bahadur Shah Zafar

POEMS

PDF Compiled by

Perso-Arabic Resource Centre, C-DAC, Pune.

ديوانِ ظفر
ابوالمظفر محمد بهادر شاه ظفر

پیش لفظ

بہادر شاہ ظفر ہندوستان کے آخری تاجدار تھے۔ جنگِ آزادی کی سربراہی کے الزام میں انہیں تخت و تاج سے محروم کر کے رنگون بھیج دیا گیا اور انہوں نے اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں گزاریں اور آج اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عالی شان مقبروں کے مکینوں کا یہ آخری چشم و چراغ اسی رنگوں کے ایک اُجڑے مکان میں آسودہ خاک ہے۔ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ صرف ایک سلطنت ہی نہیں ایک تہذیبی روایت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ ایک ایسی روایت جسے مغلوں نے اپنے دورِ عروج میں پروان چڑھایا تھا جس نے یہاں کی تہذیب کو آب و رنگ بخشا، اس کے خدوخال میں تیکھا پن پیدا کیا، اُسے وسعت اور کشادگی عطا کی، لطافت اور نزاکت بخشی۔ یہ ایسی تہذیب تھی جس میں جلال بھی تھا اور جمال بھی۔ جس نے آگرہ اور دہلی کے سنگِ سُرخ کے قلعے اپنی یادگار چھوڑے اور جس نے انسانی حُسن کے تخیل کو تاج محل کی صورت میں جنم دیا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب نے اس ملک پر ایک ایسی قوم کو مسلط کیا جو پہلے پہل صرف تجارت اور کاروبار کی نیت سے اس ملک میں داخل ہوئی تھی اور آہستہ آہستہ مختلف تدبیروں سے اس نے پہلے تجارت میں اپنے حریفوں کو ایک ایک کر کے ختم کیا اور اس کے بعد ملکی سیاست اور حکومت پر ڈورے ڈالے۔ اس ملک کی بد قسمتی تھی کہ تیمور، بابر اور اکبر جیسے شمشیر ابنِ شمشیر کے جانشین محمد شاہ رنگیلے جیسے فرماں روا اسے نصیب ہوئے اور درباروں میں بغض و حسد کینہ و سازش کا ایسا جال پھیلا کہ قوائے عمل بالکل مختل ہو گئے اور بظاہر کوئی اس ڈوبتی ناؤ کو بچانے والا نہ رہا۔

سراج الدولہ، ٹیپو سلطان، شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید اور سید اسماعیل شہید ان چنگاریوں کی طرح تھے جنہوں نے خس و خاشاک کے تودوں میں سے اُبھر کر روشنی پھیلا نا چاہی لیکن حالات نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ انہوں نے ان کی مخالفت کی اور اسی ملک کے رہنے والوں نے ان سوداگروں کے ہاتھ اس ملک کو بیچ ڈالا۔

قوے فروختندو چہ ارزاں فروختند

انقلاب کے بعد برطانوی پرچم لال قلعہ پر لہرانے لگا تو ایک نئے تہذیبی دور کا آغاز ہوا۔ اس نئے دور میں تہذیب کا تصور ہی بدل گیا۔ مشرق اور مشرقی روایات کی علمبرداری کو رجعت پسندی قرار دیا گیا اور مغرب پرستی روشن خیالی اور ترقی کی دلیل ٹھہری۔ جس لباس پر ہمارے شرفا فخر کرتے تھے اور جو شاہی درباروں کا سرکاری جامہ تھا وہ چیراسیوں

کی وردی بنا اور کوٹ پتلون پہننے والے حلال خور اور کفش دوز صاحب لوگ بن بیٹھے۔ عربی و فارسی جس پر ہماری تہذیب، زبان اور شاعر کی بنیادیں استوار ہوئی تھیں ان کی جگہ بھی انگریزی نے لے لی اور لوگ سعدی، حافظ اور عمر خیام کو بھول کر شکسپیر اور ملٹن کی باتیں کرنے لگے حالانکہ ان میں سے اکثریت ان لوگوں کی تھی جنہوں نے شکسپیر اور ملٹن کے صرف نام سُن لئے تھے اور اتنی انگریزی بھی نہیں جانتے تھے کہ ان میں سے کسی کے کلام سے دو سطریں بھی پڑھ سکیں سمجھنا تو الگ رہا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اُردو زبان اور شاعری جو اب غلاموں کی زبان اور شاعری تھی انگریزی کے سامنے بالکل حقیر نظر آنے لگی اور وہ لوگ بھی جو بظاہر بڑے قوم پرست تھے اور جن کے دل میں قوم کا درد تھا جو اس کے بھی خواہ اور سچے ہمدرد تھے وہ بھی اس احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے اور ان کو اپنی پوری شاعری شعر و قصائد کا ناپاک دفتر اور کذب و افترا کا پشتارہ نظر آنے لگا۔ ان کے بعد جو نسل آئی اس نے انگریزی پڑھی تھی اور جو برائے نام علوم و فنون پڑھے تھے وہ بھی انگریزی کے واسطے اور وسیلے سے پڑھے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے ذہنوں پر انگریز اور انگریزی ایسی طاری ہوئی کہ ان کو اپنی شاعری دورِ جہالت کی یادگار نظر آنے لگی اور وہ اپنے ادب کی اُن اصناف کو جن پر اُن کے اسلاف کو ناز تھا نیم وحشی صنف قرار دینے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو پڑھنا، اُردو میں شعر کہنا یا اُردو اور اُردو شاعری کا مطالعہ تَضِیعِ اوقات ٹھہرا۔ وہ تو خدا بھلا کرے نو لکشور کا جس نے معمولی کاغذ پر سہی، غلطیوں سے پُر سہی، اُردو شعرا کے کلام کو شائع کر کے دائمی گمنامی سے بچالیا اور نہ جس طرح آج ہم بہت سے شعرا کا کلام نایاب اور کم یاب پاتے ہیں، شاید ان میں سے اکثر کا کلام ان کے ساتھ ہی دفن ہو گیا ہوتا۔

لیکن آندھی چڑھتی ہے تو اُترتی بھی ہے۔ طوفان اور سیلاب کتنا ہی زور کیوں نہ باندھے اور کتنی ہی تباہی اور ہلاکت کیوں نہ پھیلانے ایک مدت کے بعد اسے بھی اپنا زور کھونا پڑتا ہے۔ برصغیر ہندو پاکستان کی سیاسی جدوجہد اسی زور کو توڑنے کی کوشش تھی۔ بلاشبہ یہ ایک تنکے کی کوشش تھی جو سمندر کی طوفانی موجوں کے مقابلے میں سینہ تان کر کھڑا ہوا تھا لیکن آہستہ آہستہ ان تنکوں نے ہی اس طوفان کے دھاروں کو روکنا شروع کیا۔ سرسید اور ان کے رفقاء کی تحریک نے جہاں اس ملک میں قومی شعور کو بیدار کیا اور اس کی تربیت کی، وہاں انہوں نے اُردو زبان اور ادب کو اس قابل بنادیا کہ وہ دنیا کی ترقی پسند زبان اور ادب کو اس قابل بنا دیا کہ وہ دنیا کی ترقی پسند زبان کی صف میں آنے کی ہمت کر سکے۔ جدید تعلیم نے ایک طبقہ ایسے نوجوانوں کا بھی پیدا کیا جنہوں نے جدید علوم و فنون انگریزی زبان کے ذریعے سے ضرور حاصل کیے تھے لیکن اس نے انہیں احساس کمتری میں مبتلا نہیں کیا بلکہ اپنی زبان، ادب اور شاعری کی

روایات کو زندہ کرنے اور متعارف کرانے کا جذبہ بیدار کیا۔ چنانچہ پچیس سال میں جن اُردو شعرا، کے کلام کے مجموعے جس سلیقے سے شائع ہوئے ہیں اور جس طرح ہمارے اساتذہ ادب کے کلام نظم و نثر پر تبصرے، تنقیدیں اور مقالے لکھے گئے ہیں ان سے اُردو شاعری اور ادب کے اصلی خدو خال پوری طرح نمایاں ہونے لگے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر پر جہاں اور ستم ہوئے وہاں ایک ظلم یہ بھی ہوا کہ ان کے کلام کے حصے بخرے کر دیئے گئے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی برکت سے اس کا بڑا حصہ تو استاد ذوق کے حوالے کر دیا گیا۔ باقی جو رہا اس میں مرزا غالب شریک غالب قرار پائے گویا جو شخص غیروں کے ہاتھوں اپنے تخت و تاج سے محروم ہوا ابنوں کے ہاتھوں اس کے فرزند ان معنوی بھی بانٹ دیئے گئے۔ حالانکہ اتنا ہر شخص جانتا ہے کہ بہادر شاہ اپنے حالات و واقعات اپنے مزاج و افتادِ طبع، قلعہ معلیٰ کی تربیت اور مغلیہ خاندان کی روایات کی بنا پر ذوق اور غالب سے مختلف شخصیت کے مالک تھے اور یہ شخصیت ان کے کلام میں پوری طرح ظاہر ہے۔ بہادر شاہ ایسے بچے نہ تھے کہ جو کلام ان کا نہ ہوتا وہ اس کو اپنے نام سے منسوب کر کے داد طلب کرتے اور خوش ہوتے۔ نہ وہ ایسے خوشامد پسند تھے کہ مصاحبوں کی واہ واہ کی خاطر اپنی درویشی، تصوف اور فقیری کو بالائے طاق رکھ دیتے۔ پھر جہاں تک زبان دانی کا تعلق ہے اتنا ہر شخص جانتا ہے کہ قلعہ معلیٰ اُردو زبان کی اسی ٹکسال تھی جس سے اور لوگ سند لیتے تھے۔ بہادر شاہ اس لال قلعہ میں پیدا ہوئے۔ اس میں پرورش پائی، پروان چڑھے اور وہاں کی زبان ان کے لئے کوئی آکسبانی زبان نہ تھی۔ ان سے زیادہ اُردوئے معلیٰ کا زبان داں اور کون ہو سکتا تھا۔ جس قلعہ کی اٹاؤں اور مغلانیوں سے بڑے بڑے زبان داں سند لینے آتے تھے اس قلعہ کے سردار کی زبان اور اس کا محاصرہ کس سے مستعار ہوگا۔

ظفر نے بے شمار غزلیں کہی ہیں۔ اس کے علاوہ ترجیع بند، مخمس، مسدس، قطعات، نعتیں، رباعیات، سہرے اور پنکھے بھی کلیات میں ملتے ہیں۔ ظفر بے لطف قافیوں خشک ردیفوں سنگلاخ زمینوں کے بادشاہ تھے۔ شعر عام فہم اور سلیس زبان میں کہتے تھے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں جرأت کی جھلک ملتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ تصوف میں ڈوبے ہوئے اشعار ہیں۔ روزمرہ، محاورہ بندی، رعایتِ لفظی، محاکات اور سراپا نگاری ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کا بیشتر کلام عام واردات اور عشق و محبت سے پُر ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں کلامِ ظفر کے مندرجہ ذیل نسخے نظر رہے ہیں۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

دییوان اول	مطبع سلطانی
دییوان حضور والا	مطبع دہلی اردو اخبار
دییوان راج	مطبع سلطانی
کلیاتِ ظفر	مطبع نولکشور
کلیاتِ ظفر	انوار المطابع

پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
 اُسے آہ دامنِ باد نے سرشام ہی سے بُجھا دیا
 مجھے دفن کرنا تو جس گھڑی ، تو یہ اُس سے کہنا کہ اے پری
 وہ جو تیرا عاشق زار تھا ، نہ خاک اُس کو دبا دیا
 دمِ غسل سے مرے پیشتر، اسے ہمدموں نے یہ سوچ کر
 کہیں جاوے اس کا نہ دل دہل مری لاش پر سے ہٹا دیا
 مری آنکھ بھپکی تھی ایک پل مرے دل نے چاہا کہ اٹھ کے چل
 دلِ بیقرار نے اومیاں ! وہیں چٹکی لے کے جگا دیا

میں نے دل دیا، میں نے جان دی ! مگر آہ تو نے نہ قدر کی
 کسی بات کو جو کبھی کہا ، اُسے چٹکیوں سے اڑا دیا

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
 جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
 مرا رنگ رُوپ بگڑ گیا ، مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
 جو چمن سے ابرگیا میں اُسی کی فصل بہار ہوں
 پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
 کوئی آ کے شمع جلائے کیوں میں وہ بے کسی کا مزار ہوں
 میں نہیں ہوں نغمہ جانفرا مجھے سُن کے کوئی کرے گا کیا
 میں بڑے بروگ کی ہوں صدا، میں بڑے دُکھی کی پکار ہوں

نہیں حال دہلی سُنانے کے قابل
 یہ قصہ ہے رونے رُلانے کے قابل
 اُجاڑے لیٹروں نے وہ قصر اس کے
 جو تھے دیکھنے اور دکھانے کے قابل
 نہ گھر ہے نہ در ہے رہا اک ظفر ہے
 فقط حال دہلی سُنانے کے قابل

گئی یک بہ یک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
 کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
 یہ رعایا ہند تہہ ہوئی ، کہوں کیا جو اُن پہ جفا ہوئی
 جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے
 یہ کسی نے ظلم بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لوگوں کو بے گناہ
 وے کلمہ گو یوں کی سمت سے ابھی دل میں انکے بخار ہے
 نہ تھا شہر دلی ، یہ تھا چمن ، کہو کس طرح کا تھا یاں امن
 جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اجر ا دیار ہے
 یہی تنگ حال جو سب کا ہے، یہ کرشمہ قدرت رب کا ہے
 جو بہار تھی سو خزاں ہوئی جو خزاں تھی وہ اب وہ بہار ہے
 شب و روز پھول میں جو تُلے ، کہو خارِ غم کو وہ کیا ہے
 ملے طوق قید میں جب انہیں کہا گل کے بدلے یہ ہار ہے
 سبھی جادہ ماتم سخت ہے کہو کیسی گردشِ سخت ہے
 نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ شاہ ہے نہ دیار ہے
 جو سلوک کرتے تھے اور سے وہی اب ہیں کتنے ذلیل سے
 وہ ہیں تنگ چرخ کے جور سے ، رہا تن پہ اُن کے نہ تار ہے
 نہ وبال تن پہ ہے سر مرا ، نہیں جان جانے کا ڈر ذرا
 کٹے غم ہی لکھے جو دم مرا ، مجھے اپنی زندگی بار ہے
 کیا ہے غم ظفر تجھے حشر کا ، جو خدا نے چاہا تو برلا
 ہمیں ہے وسیلہ رسول کا ، وہ ہمارا حامی کار ہے

یار تھا، گلزار تھا، مے تھی، فضا تھی، میں نہ تھا
 لائقِ پابوسِ جاناں کیا حنا تھی، میں نہ تھا
 ہاتھ کیوں باندھے مرے، پھلا اگر چوری گیا
 یہ سراپا شوخی دُردِ حنا تھی، میں نہ تھا
 بے خودی میں لے لیا بوسہ، خطا کیجے معاف
 یہ دل بے تاب کی ساری خطا تھی میں نہ تھا
 ہائے ساقی! یہ ہو سماں اور عاشقِ داں نہ ہو
 یار تھا، سبزہ تھا، بدلی تھی، ہوا تھی، میں نہ تھا
 میں سسکتا رہ گیا اور مر گئے فرہاد و قیس
 کیا انہی دونوں کے حصّے قضا تھی میں نہ تھا
 میں نے پوچھا کیا ہوا وہ آپ کا حُسن و شباب
 ہنس کے بولا وہ صنم، شانِ خدا تھی، میں نہ تھا
 اے ظفرِ یہ دل پہ میرے داغ کیسا رہ گیا
 خانہ بارغِ یار میں خلقِ خدا تھی، میں نہ تھا

بہار آئی ہے ، بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ
 رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد مے خانہ
 اسی اشکِ پری پر جان دیتا ہوں میں دیوانہ
 ادا جس کی ہے بانگی ، ترچھی چتون ، چال مستانہ
 نبھے کیوں کر مرے اور اُس پری پیکر کے یارانہ
 وہ بے پردا ، میں سودائی ، وہ سنگیں دل ، میں دیوانہ
 مجھے آنا ملے کیوں کر تری محفل میں جانا نہ
 مری صورت فقیرانہ ، ترا دربار شہانہ
 غزال دشت بولے دیکھ کر مجنوں کی میت کو
 یہ وحشی مرگیا بس ہو چکا آباد ویرانہ
 ہمارے اور تمہارے عشق کا چرچا ہے شہروں میں
 کوئی سنتا نہیں اب لیلیٰ و مجنوں کا افسانہ
 گزر یارب گلستاں میں ہوا ہے کس شربانی کا
 کہ شاخیں جھومتی ہیں ، نالہ بلبل ہے مستانہ
 ظفر وہ زاہد بے درد کی ، ہُو حق ، سے بہتر ہے
 کرے گر رند دردِ دل سے ہائے ہُوئے مستانہ

کیا غزاں آئی چمن میں ہر شجر جاتا رہا
 چین اور میرے جگر کا بھی صبر جاتا رہا
 کیا خوشی ہر ایک کو تھی کر رہے تھے سب دُعا
 جب گھسی فوج نصاریٰ ہر اثر جاتا رہا
 کیوں نہ تڑپے وہ ہما اب دام میں صیاد کے
 بیٹھنا دو دوپہر اب تخت پر جاتا رہا
 شام کو غنچہ کھلا تھا چوک کے بازار میں
 اب وہاں پر یا خدا لاکھوں کا سر جاتا رہا
 رہتے تھے اس شہر میں شمس و قمر حورو پری
 لوٹ کر ان کو کوئی لے کر کدھر جاتا رہا
 آگوں تھا یہ شہر دہلی اب ہوا اُجڑا دیار
 کیوں ظفرؔ یہ کیا ہوا جو بن کدھر جاتا رہا

کون نگر میں آئے ہم کون نگر میں با سے ہیں
 جائیں گے اب کون نگر کو من میں اب ہر اسے ہیں
 دیس نیا ہے بھیس نیا ہے، رنگ نیا ہے ڈھنگ نیا ہے
 کون آنند کرے ہے واں اور رہتے کون اُدا سے ہیں
 کیا کیا پہلو دیکھے ہم نے گلشن کی پھلوری
 اب جو پھولے اس میں پھول کچھ اور ہی اس میں با سے ہیں
 دنیا ہے یہ رین بسارا بہت گئی رہ گئی تھوڑی سی
 ان سے کہہ دو سونہ جاویں نیند میں جو کہ نندا سے ہیں

لگتا نہیں ہے جی مرا اُجڑے دیار میں
 کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں
 بلبُل کو پاسباں سے نہ صیاد سے گلہ
 قسمت میں قید تھی لکھی فصل بہار میں
 کہہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
 اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغ دار میں
 اک شاخِ گل پہ بیٹھ کے بلبُل ہے شادماں
 کانٹے بچھا دیئے ہیں دلِ لالہ زار میں
 عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
 دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
 دن زندگی کے ختم ہوئے شام ہوگئی
 پھیلا کے پاؤں سوئیں گے گنجِ مزار میں
 کتنا ہے بدنصیب ظفرِ دفن کے لئے
 دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں

○○○